حدیثِ نفس

ڈاکٹر محمد زبیر قریشی

© جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت میں گجرات اُردو اکادمی کا
جزوی مالی تعاون شامل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

کتاب کا نام - حدیثِ نفس
شاعر - ڈاکٹر محمد زبیر قریشی
اشاعت - سنہ ۱۴۱۵ھ مطابق سنہ ۱۹۹۵ء
تعداد - ۵۰۰
کتابت - محمد صادق انصاری
مطبع - خطیب کتاب گھر اینڈ پرنٹرس خاص بازار احمد آباد
تقسیم کار - ہدایت بک ڈپو، بلال کامپلیکس، رکھیال، احمد آباد۔ ۳۸۰۰۲۳
قیمت -

مجبوریوں کو آپ نے دیوار کر دیا
بیمار غم کو اور بھی بیمار کر دیا

سمجھا ہے ہم کو زینہ اول حضور نے
ہمدردیوں کا آپ نے بیوپار کر دیا

منظور ہو گئے ہیں نظر کے وہ اسطرح
میری نظر میں خود مجھے اغیار کر دیا

تاثیر کونسی ترے جلوہ میں تھی صنم
بیدار دل میں جلوۂ ایثار کر دیا

گزرا ترا خیال کہ لہرائی برق سی
سینہ میں داغ طور سا انبار کر دیا

پردہ کیا ہو بت نے سنا تو نہیں ہے پر
پردہ نشین بت نے پرستار کر دیا

کانٹے چبھے ہوں پھول کو ایسا ہوا نہیں
پھر کس خلش نے تجھ کو دکھی یار کر دیا

سوز و گداز و آتش باطن نے شمع کو
ڈھلنے کو ایک سانچے میں تیار کر دیا

کیا قہر برگ دبار سے ڈرتا نہیں ہے عشق
لو شمع موم دل نے اسے خوار کر دیا

موم اور ستم سمجھ میں نہیں آتی ہے یہ بات
ای شمع تجھ کو کس نے جفا کار کر دیا

دُرِّ یتیم حسن گراں قدر تھا زبیر
خود کو بالآخر آپ خریدار کر دیا

صنم اعتبار تجھ پہ بہت استوار ہوتا
پس نقض عہد گر تو کبھی شرمسار ہوتا

نہ کہیں کسی نے دیکھا مگر اسکو یوں جتے ہیں
اُسے گر گراں تھا آنا تو مجھے ہی بار ہوتا

بحدیث عشق خوگر قدم ایک کاش اٹھتا
تو یہ راہ رفتنی ہے تجھے آشکار ہوتا

بحدیث نفس دلمیں نہ حلاوت آتی ہرگز
کہیں حل ترا تصور جو نہ گل عذار ہوتا

غم عشق شے عجب ہے کہ ہے درد بھی دوا بھی
یہ شریست گر نہ ہوتا لیا مستعار ہوتا

نگہ کرم ہے اسکی متلاشی بہانہ
مری طبع حیلہ جو پر وہ نہ کیوں نثار ہوتا

تری ضو مکتسب سے جو وجود وار تقا ہے
بفروغ کیوں نہ ذرہ مہ تاب دار ہوتا

وہ سکت نہیں جو مجھ میں کہ خود آسکوں میں تجھ تک
ترے راہ رو سے لپٹا کوئی ایک خار ہوتا

جو ہمیں بھی خضر ہو علم لدن عطا خدا سے
تو ہمیں بھی زہر مصلحت رب گوار ہوتا

رُکے اجنبی مسافر بہ سرائے تاکہ دم لیں
یہاں کس طرح زبیرا کوئی یار غار ہوتا

تحفہ ملا ہے خواب سے دیدارِ ماہ کا
جاگے تو ہے خیالِ مہِ نیم ماہ کا

تخلیقِ صبح و شام سے کہتا ہے یہ خُدا
مالک ہوں صرف میں ہی سفید و سیاہ کا

یہ بے زبان آگ تو اظہار بن گئی
چرچہ ہے میرے بعد میں دودِ تباہ کا

منزل موالغات کو بخشی ہے بارہا
دامن میں لے چلا ہوں ہر اک خارِ راہ کا

مانگے کے اشک پھول بہاتا ہے روز صبح
بلبل گماں نہ کر ہے اثر تیری آہ کا

ہر شخص کا شعار محبّت ہے فطرتاً
سہرا ہے میرے نام پہ رسمِ گناہ کا

ہے نصب عین اک رُخِ زیبا زبر بس
اس سے بڑا کوئی نہیں منصب نگاہ کا

گناہ گارِ محبت نے اعتراف کیا
تو پھر شریکِ خطا نے اسے مُعاف کیا

کیا ہے عہد نہ چھوئیں گے ہم انھیں ہرگز
اگرچہ دل نے اسی وقت اختلاف کیا

غبارِ پائے خطا کا نہ خوف رکھ اے دوست
کہ خواب میں کبھی میں نے نہ انحراف کیا

گیا نہ شمع کے پیچھے کبھی بھی پروانہ
مگر ملے تو دل و جان سے طواف کیا

سُنا ہے تحفہ سے اُلفت زیادہ ہوتی ہے
اسی امید پہ اس دل کو اتحاف کیا

میں جانتا ہوں تمہیں غیر ہی کا ہونا ہے
گو چند روز مرے دل میں اعتکاف کیا

نہ وعدہ ہے نہ سلام و پیام و پیماں ہے
عجب طرح سے ہمیں عشق نے مطاف کیا

بایں قصور و تجاوز زہ نصیب مجھے
بحُسنِ خلق مسرت سے اتصاف کیا

زبیر کو نہ سمجھنا غلط خُدا کے لیے
مری طرف سے بتا تو نے دل کو صاف کیا

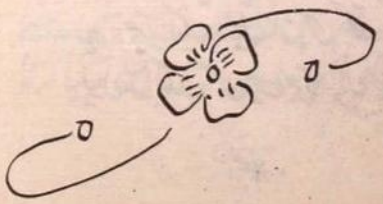

رنگ تو لائے مرا دستِ بداماں ہونا
کون دیکھے یہ ترا سر بگریباں ہونا

احتساب عمل کردہ کیا تھا اک دن
اُف قیامت ہے یہ تنہائی میں عریاں ہونا

بَیْنَ جَنْبَیْکَ عدو ہے ولی سادہ لوحی
نفس کے ہوتے ہوئے غیر سے نالاں ہونا

مجری دم ہوا شیطان تو رحماں اقرب
ہے عجب جامع ضدین یہ انساں ہونا

مصحف النفس و آفاق کا حامل کر دے
التواء میں ہے کیوں اقراء کا فرماں ہونا

کاش مل جائے مجھے کوئی مسیح دوراں
خوں رلاتا ہے مجھے روح کا بے جاں ہونا

شکل اپنی نہ کہیں آئینے میں دیکھی ہو
بے سبب تو نہیں انگشت بدنداں ہونا

آنکھ کھلنے پہ بھلا دیکھئے کیا ہوتا ہے
زندگانی فقط اک خواب پریشاں ہونا

تھا کبھی میں بھی مشرف بہ کلیم اے موسیٰ
یاد ہے مجھ کو مرے لب سے ادا "ہاں" ہونا

ہے زبیرؔ ایک دلیل کرم حق تجھ پر
یوں ترا ملک سخن میں بھی قلمراں ہونا

٭

دلِ مجروح کا درماں نہ کرتا میں تو کیا کرتا
گر اس طرار کا ارماں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

کسی کی دل رُبائی کی ادا اللہ رے توبہ
عدو کو واصلِ حرماں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

ہجومِ شوق مستولی ادھر آمادگی اُن کی
دِفاعِ بعد اگر چنداں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

وہ بیٹھے لب بہ مہر آکر بالآخر خود ہی تنگ آکر
خموشی نطق پر قرباں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

تنک چشمی ہوئی اُن کی سکونِ قلب کی طالب
متاعِ کس مخ ارزاں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

ترحّم تیری سنّت ہے مری طینت گنہ گاری
الٰہی تو بتا عصیاں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

مخالف عالمِ دیں ہے زبیرؔ محترم سُنئے
مری تکفیر کا ساماں نہ کرتا میں تو کیا کرتا

بزمِ ہستی میں فقط میں ہی نہ حیراں نکلا
جامۂ لفظ میں مفہوم بھی عریاں نکلا

کافروں کو نہیں تکفیرِ مسلماں کا حق
کافرہ میں تو مسلماں کا مسلماں نکلا

مثلِ آدم نہ کرے اک نئی دُنیا آباد
گو مرے دل سے نکلنے کو تو ارماں نکلا

ہاتھ خالی ہی جہاں سے تو گیا تھا لیکن
حشر کے روز مرے ہاتھ میں داماں نکلا

طفلِ مکتب کی طرح میں نے بہ لوحِ تخئیل
نقشِ اوّل ہی بنایا تو پری ساں نکلا

کشمکش تھی تنِ خاکی سے رہائی کیلئے
آخرش سانس مرے تن سے پر افشاں نکلا

ہے زبیدہ اسم ترا خوبی کی طرح بزمِ عجب
وقت ہر چند بہت قاطع و بُرّاں نکلا

چپکے چپکے سی کے لب انکو پکار آئے تو کیا
سہمے سہمے دل ہی دل میں اُن پہ پیار آئے تو کیا

جاں بلب ہے بیقراری ترکِ رسمِ انتظار
پیکرِ تخئیل تجسیمِ قرار آئے تو کیا

ہم سفر اک موڑ تک ہیں منزلیں اپنی الگ
چند قدموں کے لیے اک رہ گذر آئے تو کیا

تاب لانا جنکی مشکل ہے زمانے کیلئے
چاند سورج لیکے وہ لیل و نہار آئے تو کیا

گردشِ ایام سے ہے شیشۂ دل چور چور
اب کہیں سے کوئی دل کا پاسدار آئے تو کیا

ہو چکی تشخیص لیکن اک سرا ملتا نہیں
ایسے رشتہ پر ذرا سا اعتبار آئے تو کیا

جب نہیں ہے مجھ کو اپنے آپ پر کچھ اختیار
آپ ہو کر جانِ من بے اختیار آئے تو کیا

دور سے چُپ چاپ مجھ کو وہ جلاتے ہی رہے
بینشِ معصومی سے شمع بے شرار آئے تو کیا

راکھ میں چنگاریاں پہلے ہی سے موجود ہیں
اور اس پر اک شرارِ خاکسار آئے تو کیا

باغِ دلیمیں ہے ابھی دورِ بہارِ گل فگار
اب اسی اثناء میں اک اور نو بہار آئے تو کیا

اندمالِ زخم ہے اس کا ہرا رہنا زہے
مرہمِ زخمِ جگر وہ جاں نثار آئے تو کیا

تخیّل میں ہوا ہے جو سرایت
حدیثِ نفس ہے اس کی حکایت

یدِ بیضا انھیں تو حسن میں ہے
یہ اِک اجمال ہے بس بے نہایت

گلوں میں رنگ و بو و دلکشی سب
ہے اشک صبحگاہی کی عنایت

تری جانب جھکے ہیں جان و دل بھی
جھکی نظروں کی کرتے ہیں رعایت

جفا کہتی ہے وہ بھولے نہیں ہیں
مجھے کیوں کر پھر ان سے ہو شکایت

یہ مشکِ عشق چھپتی ہی نہیں ہے!
حقیقت ہو گئی دیکھو روایت

لرز اٹھا جوں عکس آب کچھ پل
ہے لمسِ بے ارادہ غرض و غایت

مراحل معرفت کے طے ہوں کیسے
کہ ہر اک انتہا ہے اک بدایت

غذا پہنچائے روحِ قید کو بھی
زبیدہ اللہ دے تن کو ہدایت

ہو عشق گو معاملہ آتش فشاں کیساتھ
آتا ہے ایک پارہ دل ہر فغاں کیساتھ

ہر آن کاروبار ہے مجھ کو زیاں کیساتھ
وَالعَصر کی ہے مہر لگی میری جاں کیساتھ

باندھی علف امل کی ہے بالتو سن حیات
دوڑے ہے بے مرام گیاہِ دواں کیساتھ

تھا موسم بہار کبھی خانہ زاد عزم
اب مثل ذرہ چل دیے باد خزاں کیساتھ

تا بے نمک رہے نہ کہیں خوانِ زخم قلب
کچھ حسرتیں بھی ہو گئیں اشک رواں کیساتھ

اہل چمن جو کرتے ہیں گل چینی اختیار
در پردہ ان کو بیر ہے خود گلستاں کیساتھ

رُخ پر سیاہ خال سے گزرے ہے یہ گمان
چہرہ نہ جل گیا ہو نقاب کتاں کیساتھ

بار حیات ہی نے کمر توڑ دی زبیر
بار امانت اور ہے مجھ ناتواں کیساتھ

انتساب

اپنے والدِ ماجد مرحوم غلام نبی قریشی کے نام
جن کی صعوبتوں اور دعاؤں کے صلہ سے
فضلِ ربّ کی شکل میں عمر بھر مستفیض ہوتا
رہوں گا۔

آہ کو قاصد بناتا تو ہوں پر
لوٹ کر آئے گا یہ پیغام بر
ٹوٹ کر دل جزوِ اُلفت ہوگیا
دولتِ دل لٹ کے ہے معمور تر
یاد کے سایوں کی طولانی سے پوچھ
دور وہ مجھ سے ہوئے ہیں کسقدر
وہ ملے پر کہہ سکا نہ مدعا
خواب کی باتوں کو چھوڑا خواب پر
وصل، کشّاف تصور ہوگیا
جس قدر ایہام تھا آیا نظر
مثل خامہ ہوں بسجدہ اشک ریز
نفس مضموں سے نہیں میں باخبر
روح فرسا خامشی ہے آپ کی
کچھ تو کہیے ماجراء مختصر
جلوہ محبوب کا بن جائے روپ
نیند کو آنا ہے آنکھوں میں اگر
نقشِ پائے یار مل جاتے اگر
ڈھونڈ ہی لیتا زبیرؔ ان کی ڈگر

چونکہ گرے ہوؤں کا ٹھکانہ ہے میرا گھر
برقِ فلک زدہ بھی چلی آئی بے خطر

یہ غم نہیں ہے وہ کہ جو مرہون لفظ ہو
بن جائے کاش آج میری آہ نامہ بر

دیکھا اُسے تو نقش بہ دیوار ہو گیا
لو جان سے گیا میں بہ دیدار چارہ گر

چھوٹی ندی ہی لاتی ہے اکثر تباہیاں
ہے بحر موجزن، متجاوز نہیں مگر

ہے حسن بے نیاز پہ آتا نہیں سکون
تا اضطرابِ عشق کی اس کو نہ ہو خبر

اپنے پھلوں کے بوجھ سے شاخ شجر جھکی
خود دار و سر بلند رہا سروِ بے ثمر

تکمیل تو ہمیشہ نقیبِ زوال ہے
تنقیص کا شکار ہوا دیکھئے قمر

اربابِ اختیار تو بس اہلِ عقد ہیں
حل کے لیے نہ ان پہ زبیر اعتبار کر

مرے گناہ مسلم یوں لاجواب نہ کر
ہے مغفرت ہی بالآخر تو پھر حساب نہ کر

سفر دراز کیا با قلیل توشۂ راہ
قصر سفر میں اگر کی بھی تو عتاب نہ کر

مُراجعت ہے وطن کو قیام گاہ قریب
نہ روک راہ مری سخت احتساب نہ کر

تمام عمر تو ستّار عیب پوش رہا
بروز حشر اچانک ہی بے نقاب نہ کر

نظر ملی ہے تو وہ فیصلہ تو کر لیں ذرا
مجھے پسند نہیں سوئے ظن شتاب نہ کر

غلط نگاہ سہی بابِ دل تو کھول دیا
نگاہ پھیر کے دانستہ سد باب نہ کر

اگر سکون ملے آنکھ بند کر ورنہ
بلا دلیل تو انکارِ آفتاب نہ کر

ہے اک خزانہ مخفی یہیں ظہور پسند
زبیرؔ سے کہو نقص دل خراب نہ کر

مثلِ براہیم گہ شاملِ اعزاز کر
آیتیں اپنی دکھا مومنِ ممتاز کر
مرحلہ وسوسہ مکمّلِ ایمان ہو
طالب اسرار ہوں تو مجھے ہمراز کر
وسعتِ رحم و کرم دیکھ کے ہوں لب کشا
بات بڑی کہہ گیا گر نظر انداز کر
کیسے نصیب استقامت ہو بغیر اصطفیٰ
قبض بہت ہو چکا چشم کرم باز کر
ہے سمک زندگی پیٹ میں مجھکو لیے
رغبت تسبیح دے اصل جہاں باز کر
درجہ اعلیٰ ملا کس کو بلا تربیت
اہل نہیں پر عطا مرشد دم ساز کر
مرغ رواں کھینچ رہا ہے طرف دام گہ
صوب علا تو اسے مائلِ پرواز کر
مات ملی پے بہ پے ہار گیا حوصلہ
معرکۂ نفس میں مجھ کو سرافراز کر
دست بدعا ہے زبیر اور یہ ہے التجا
چند ملائک بہ آمین ہم آواز کر

○

آفتابِ حسن تیری ہے نظر گہہ گاہ بس
ہو رگ جاں میں سرایت بوند باری سے برس
کاروانِ بوئے گل نے رخت باندھا دیکھئے
سنسناہٹ ہے صبا کی صبح دم بانگ جرس
گتھیاں ملت کی سلجھانے بڑھایا تھا جسے
ناخنِ انگشتِ پا ثابت ہوا وہ ہم نفس
ہے محرک حسن لیکن اک قدم بڑھتا نہیں
عشق نے کی راہ سب طے طور تک لینے قبس
سایۂ غم باوفا ہے ساتھ اندھیروں میں دیا
ہے صدائے بازگشت آہوں کی اک فریاد رس
اک کرن لطفاً ملی کیا ہو گئی خفاش مست
خود وجودِ خور میں ہے کم ظرف کو اب پیش و پس
ہو اضافہ یا کمی ہموار سطحِ آب ہے
اشتراکِ معتدل پر صرف ہے پانی کو بس
وسعتِ بنیاد سے ہے قلۂ کوہ سربلند
بادِ بے بنیاد سے ہے رفعتِ خاشاک و خس
بعد مرجھانے کے جن میں رنگ و بو پیدا ہوئے
تھے زبیرؔ ایسے گل گمنام شکل ہیچ کس

-|-

حُسن کے واسطے جائز ہے محبت میں خداع
خاصا جب کہ ہو دشوار بہت دردِ وداع

میرے سینے میں ملا گم شدہ قلبِ دلبر
جیسے یوسف کو ملا تھا کبھی مفقود صواع

روشنی آتشیں ہوتی ہے کشش پر مت جا
شمع شعلہ ہے بالآخر تو سمجھتا ہے شعاع

کھا گیا سادگی دہ کو تمدن کا ہجوم
سے شہر میں اب بھی ہے لیکن دلِ ویران دفاع

مشک پاشی بھی تو ہے زلفِ پریشاں کا شغل
زخمِ دل کیسے بھرے کیسے ہوں بہتر اوضاع

اختلافات کو درکار ہے اک سطح بلند
تاکہ ہو نعم بدل گر نہ ہو ممکن اجماع

ریشمی رشتے کی کھلتی ہے گرہ مشکل سے
ظلمتِ زلف میں ہوتا ہے سرا بھی تو صداع

نقرئی ہاتھ میں رہتا ہے مرا قلب زبیر
کیا عجب ہو جو سیہ داغ گراں قدر متاع

لگی ہے جب آگ دونوں جانب خموشی و انتظار کب تک
تمہیں بتاؤ کہ مسئلہ ابتدا کا وجہ وقار کب تک

جمع تمنا کی ہو کے بوندیں گریں فلک کی بلندیوں سے
نہ پارہ پارہ دوبارہ ہوتا بزور خود آبشار کب تک

کرم کریں یا کہ ظلم وہ پر سوال دل میں یہ اٹھ رہا ہے
یہ بے یقینی یہ بے قراری یہ بے خبر اضطرار کب تک

دیا ثبوت وفا وطن سے بہا کے خوں کی تمام حجت
مرے وطن میں ہی ہم وطن میں رہوں غریب دیار کب تک

مہیب عاصف جہان میں ہو نصیب ذرہ سکون کیسے
رہیگی بکھری یوں ہی الٰہی مری یہ مشت غبار کب تک

ازل سے جلوہ گہ نظر عشق کا رہا حسن خود نما جب
تقاضۂ حسن کو رہے گی بفطرت عشق عار کب تک

فتیلۂ روح کے ذریعہ کچھ آتش عشق مشتعل ہے
مگر یہ سیماب دل نہ ہوگا زبیرؔ قائم بہ نار کب تک

احساسِ ظلم ہی نہ ہو تو کیسے ہو قلق
چہرہ پہ ہے فلک کی طرح سرخیٔ شفق

بند نقاب وا پہ سراپا حجاب ہیں
احسان پر وہ پردہ کا دیتے ہیں یوں سبق

مطلق ہے حسن پھر بھی تقید پسند کیوں
میری سمجھ میں آ نہ سکا نکتۂ ادق

لوگوں کا ہو گیا ہے تنفس گرہ دار
ارباب حل و عقد کریں کچھ تو پاس حق

اعیان ممکنہ سے ہے تخلیق ناتمام
ہوں گے کچھ اور کلک تخیل سے اب بھی شق

تھا کوہ غم گو صفحۂ دل پر رکھا ہوا
پر باد امتداد الٹ کر رہی ورق

تلقیح سے کِھلے مری شہرت کے پھول دور
بوئے رواں ہے بابِ مشام وطن پہ دقّ

بوی حبیب گنج سے آوردہ باد کا
اس کے لیے زبیرؔ رقیبوں سے ہے احق

غزل مترجمہ (حافظ)

گل در بر و می بر کف و معشوق بہ کام است
سلطان جہانم بہ چنیں روز غلام است

گل پاس ہے مے ہاتھ میں ہے یار بھی مائل
سلطانِ جہاں میری غلامی کا ہے قائل
ہاں شمع نہ لائے کوئی اس بزم میں کہہ دو
اس رات یہاں بدرِ رخِ یار ہے کامل
گو مذہبِ رنداں میں ہے جائز مے گلگوں
بن تیرے پری چہرہ پہ تحریم ہے حائل
آوازِ نی و چنگ پہ ہوں میں ہمہ تن گوش
ہے آنکھ میری لعلِ لبِ جام کی سائل
کچھ ذکر نہ کر چاشنیٔ قند و شکر کا
وہ ہے ترے شیریں لبوں سے مجھے حاصل
جب سے دلِ ویرانہ ترے غم کا ہے مخزن
دائم بہ سر کوی خرابات ہوں نازل
اس ننگ سے مت عار دلا ہے مری شہرت
ہے عار مجھے نام سے مت پوچھ اے عاقل
آوارہ و مے خوار و نظر باز ہیں لیکن
اس شہر کا ہے کون جو ہم میں نہیں داخل
کیوں محتسبِ رند سے کہتے ہو مرے عیب
وہ بھی تو مری طرح پے عیش ہے عاجل

محفل میں ہماری نہ کوئی عطر ہی لائے
ہر آن تری زُلف سے خوشبو تو ہے شامل
کیوں بے مے و معشوق گذارے کوئی پل بھی
ایام گل و عید ہیں یہ حافظِ غافل

کم لولوئے حافظ کی زبیر آب نہ ہوگی
مانا میں انھیں چھونے کے ہرگز نہیں قابل

--*--

پیش لفظ

ڈاکٹر زبیر قریشی گجرات یونیورسٹی میں فارسی کے ریڈر ہیں۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں غیر معمولی استعداد پیدا کی ہے۔ اور انگریزی اور گجراتی زبانوں کے بھی ماہر ہیں۔ وہ عربی اور فارسی کے مخطوطات اور دستاویز کو اتنی ہی روانی سے پڑھ اور سمجھ لیتے ہیں گویا وہ جدید مطبوعہ نستعلیق تحریر میں ہوں۔ انھوں نے فارسی کے کلاسیکی شاعروں کا نہایت جامعیت سے مطالعہ کیا ہے۔ فارسی زبان کے سیمیناروں میں وہ اپنے تحقیقی مقالے بھی فارسی زبان ہی میں پڑھتے ہیں۔ انھیں تحقیق سے گہرا ربط ہے۔ اور سلاطین کے عہد میں گجرات کے عربی اور فارسی علماء اور ان کی تصانیف کا انھوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کے متعدد مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اب وہ اپنے تحقیقی مواد کو ایک مستقل تصنیف کی صورت میں ترتیب دے رہے ہیں۔ اُردو تخلیقات کو گجراتی زبان میں ترجمہ کر کے زبیر قریشی گجراتی ادب میں بطور مترجم کے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے گجراتی صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا ہے، اور ایک دلچسپ کالم نگار کے طور پر کامیابی حاصل کی ہے۔

اور اب وہ حدیثِ نفس کے ذریعہ ایک شاعر کی حیثیت سے نمودار ہو رہے ہیں۔ نمودار کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ زبیر نے نہ تو مشاعرے پڑھے نہ اپنا کلام اشاعت کے لیے رسالوں میں بھیجا۔ لہٰذا بحیثیت شاعر کے ان کا بروز بہت سوں کے لیے باعثِ تحیّر و استعجاب ہوگا۔

زیرِ نظر مجموعہ سے قبل وہ اپنی بیاض مجھے دکھاتے اور گم کرتے رہے۔ دو بیاضیں کھونے کے باوجود انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا اور تیسری بیاض لے کر حاضر ہو گئے کہ پیش لفظ چاہیے۔ ان کی پُرگوئی میرے لیے حیران کن تھی۔ اُردو تو ان کے لیے غماز گیر بھی ثابت ہوئی کیونکہ اُردو کو انھوں نے اتنا نہیں پڑھا جتنا فارسی اور عربی۔ اگر وہ فارسی میں شعر

گلہ اُن کی جفاؤں کا کروں لیکن یہ ہے مُشکل
مرا مسلک ازل سے ہے حسابِ دوستاں در دل

یہ دل کی آگ ہے بجھتی نہیں آنسو بہانے سے
زہے قسمت جو کام آجائے تیرے میری مُشتِ گِل

خدا ناکام ہونے دے نہ کوشش گرچہ پہلی ہے
تری ضربِ نگاہ اوّلین ہو ضربِ فتحِ دِل

میں اپنا مدعا سمجھا نہیں سکتا انھیں شاید
تمنا کے مری حرفوں کی ہے ترتیب ہی مہمل

یہ مضرابِ نظر سے تار دل کو چھیڑتے تو ہو
سنے بھی جائیں گے تم سے بتاؤ نالۂ بسمل

تری یہ کج ادائی کج نگاہی کجروی توبہ
بزرگوں نے کہا ہے بارِ کج پاتا نہیں منزل

مجھے ان سے محبت ہے انھیں بھی مجھ سے الفت ہے
ہمارے درمیاں اب بھی تمنا ہے مگر حائل

زباں بخشی ہے گہرائی کو موجوں کے تلاطم نے
کفِ سیلاب تیرے ہیں زبیرؔ اک شاہدِ عادل

نور میں نار نہاں ہوتی ہے جیسے باہم
میں ہمیشہ ہی نہاں ہوں تیرے جلووں میں ضم

بعد مدّت کے ملے ان سے تو محسوس ہوا
جیسے حوا سے ملے ارض پہ مایوس آدم

سوزش دل پہ یہ تسکین تصنع آمیز
بے سبب آگ پہ سرکار نے رکھا مرہم

سامنے ہے مرے تنہائی میں سایے کی طرح
جمع میں مجھ میں سما جائے ہے میرا ہم دم

بھر گیا زخم جراحت کا نشاں باقی ہے
غم بھی مِٹ جائے جو مٹ جائے یہ احساسِ غم

عشق پروانہ کی آتش سے ہوئی روشن شمع
اپنی ہی آگ کی جانب تو نہیں اس کے قدم

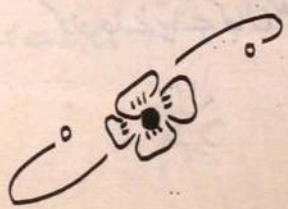

صفحۂ دہر پر ہے یہ مرقوم
عُسر لازم تو یسر ہے ملزوم
ہو عطا آہ نیم شب وحجاب
نعمت بے بدل سے ہوں محروم
لذت نفس کی حقیقت دیکھ
خود بخود ہی ضمیر ہے مذموم
آب حیواں تو تھا ہی یاں ناپید
خضر بھی اب جہاں سے ہیں معدوم
قلب بیدار و چشم خواب آلود
مردگی سے سدا رہوں معصوم
انہماک خیال تو ہر آن
پاس انفاس ہو گیا موہوم
غنچۂ باطنی ہو کیسے پھول؟
ہو تنفس کی جب ہوا مسموم
ہے تخیل ہمیں آج ایسا کون
کیوں نتیجہ ہے فکر کا منظوم
ہے ہدایت زبیر کی مرزوق
کون جانے یہ ہے کہاں مقسوم

نگاہوں کی باہیں تصوّر کا آنگن
یہ ہے تیرا ماوٰی وہ ہے تیرا مسکن
یہ پلکوں کا سایہ یہ زلفوں کی ظلمت
یہ دو ظلمتوں میں ترا چہرہ روشن
نظر، چشم و چہرہ یہ سُرخی حیا کی
پیام محبّت مسلسل معنعن
تو میدی غزل کا مجسّم تغزل
ہے میرا فسانہ تجھی سے معنون
تنفس کے شعلوں سے رخ پر تمازت
پھر آنکھوں سے اس پر برستا یہ ساون
رَواں جوئے خوں ناب ہے سنگدل سے
یہ تھی وصل کی کیا نئی شرط کوہکن
نِگاہ صنم یا ہے شیرازہ جمع
پریشاں دلی کو مِلا ایک مامن
یہ چہرہ پہ ہے خال یا آیتِ حسن
ہوا ختم جیسے یہاں آکے ایک فن
زبیدہ ان کو اُٹھ کر منانے چلے ہیں
تصور میں جن سے ہوئی تھوڑی اَن بن

آپ کا یہ حضور سولہواں سن
شمع گویا کہ ہوگئی روشن

داغ دھونے کے وہ نہیں قائل
رنگ لیتے ہیں ہر دفع دامن

ڈھانک دیتی ہے خاک ہر شے کو
تیرگی بن گئی ہے اس کا تن

خرد تاروں کو اس نے چمکائے
آسماں کا چمک گیا آنگن

پست و عالی میں فرق ہوتا ہے
آسمان و زمین کا بیں سے

سر کٹے گا زباں نہیں کٹتی
کہہ گئی حق بروی مرد و زن

مرد آزاد شمع سے سیکھے
لب کشائی کی جرأت اور لگن

گل کھلیں وہ جگہ نہیں گلزار
یہ زمانے کا ہو گیا ہے چلن

بعد کھلنے کے بعض پھولوں کو
مل سکا گلشن اور نہ ہی بن

ہر زباں کا ہے ملک میں صوبہ
بس نہیں ہے مری زباں کا دہن

پامرا کچھ ہوا ہے لنگ زبیر
کچھ ہوا تنگ اسکا ملک چمن

ہلال و بدر یک جا ہیں یہ چہرہ کا انوکھا پن
سحر ہے معجزہ ہے یا کہ تیرے حسن کا جوبن

پسینہ ہے جبینِ گل پہ بلبل کی نگاہوں سے
مگر شبنم کے قطروں سے نہیں ہے پھول تر دامن

صراط مستقیم عشق میں کیا خود حسن ہے رہبر
کہیں بھٹکے نہ پروانہ ہوئی ہے شمع یوں روشن

سنا غیروں سے حال دل کہ جو تھا دید کے قابل
شنیدہ پھر شنیدہ ہے نہ کیوں ہو لاکھ منّ وعن

یہ دودِ آہِ حسنِ بے زباں ہے یا کہ بوئے گل
پریشاں ہے ترے نالوں سے اے گل و گلبن بلبل

بتِ نوخاستہ کا وہ کوئی بے نام شیوہ تھا
ادائے دل ستانی تھی تفنّن تھا کہ کوئی فن

دل مردم گزیدہ کو اگر دم ساز مل جائے
نہ زیبِ طاقِ وحشت ہو نہ عزلت کے لئے بن

بیاں ممکن نہیں اسکا عیاں ہونا بھی پردہ ہے
نہادِ حسن ہے مستور ہو وہ مثل جانِ تن

ہوا کے یہ تھپیڑے ہی تجھے بخشیں گے تقویت
دیے کی لو سے آگے بڑھ زبیرؔ ایکبار شعلہ بن

--

طائف رہیں اگرچہ ہر اک سن میں بجلیاں
پا رکھ سکیں نہ فضل کے مامن میں بجلیاں

اوروں کی قبر کھودنا آساں نہیں اے دوست
اپنا بنا کے سو گئیں مدفن میں بجلیاں

سرسبزیٔ چمن تو بدستور ہے یوں ہی
اک شاخ کو جلا گئیں گلشن میں بجلیاں

زرخیزیٔ زمین تو قائم ہے آج بھی!
گو پیچ و تاب کھا کے گریں بن میں بجلیاں

اپنی بلندیوں سے گریں تب کہیں ندیم
تنکوں کو راکھ کر سکیں گلبن میں بجلیاں

اک طرح نو کی پڑ گئی بنیاد ہر دفعہ
سر کو پٹخ کے جب مریں آنگن میں بجلیاں

جوہر تو طبع کا ہے درخشندہ خیز کن
تم نے سنا گریں کبھی معدن میں بجلیاں

دشمن ہوئے زبیر کے حاسد بڑے بڑے
پلتی ہیں آسماں ہی کے دامن میں بجلیاں

نہ سمجھے اصطلاح دل اسے نادان کہتے ہیں
یہاں جو دل کا مالک ہو اسے مہمان کہتے ہیں

جزاک اللہ صبا تو نے دیا ہے رہبر کامل
ملا دے یا سے اس خضر کو ریحان کہتے ہیں

دیا اس ہاتھ سے دل یوں کہ نہ اس ہاتھ نے جانا
بتایا یہ بھی اس نے کہ کسے احسان کہتے ہیں؟

کسی کا خواب و بیداری پہ چھا جانا قیامت ہے
اسی حالت کو اہل دل مگر ارمان کہتے ہیں

نظر کے تار چھڑ جاتے ہیں از خود دیکھ کر تجھ کو
نوائے چشم ہی کو عشق خوش الحان کہتے ہیں

مری باتوں پر انکو اعتبار اب آچلا ہے کچھ
تیقن چاہیے کے ان کے یہ سامان کہتے ہیں

دل و جاں سے ہم ان کے حسن پر ایمان لے آئے
ہمیں اسیر بھی بے کھٹکے وہ بے ایمان کہتے ہیں

وہ کہتے ہیں مری آنکھوں پہ رکھ کر ہاتھ سچ بولو
محبت میں اسے وہ بیعت ایقان کہتے ہیں

زبیرؔ انکو ہوا احساس کیا سنتے ہے ہمیں پیاری
تمہیں میری قسم ہاں سچ ہے نہ ایمان کہتے ہیں

بات بنے یا نہ بنے اس سے سروکار نہیں
ہے مگر افسوس مجھے جرأت گفتار نہیں

تا بلب آئے نہ کیوں شکوۂ بیداد و جفا
گاہ گہ مجھ پہ بھی عنایت سے انھیں عار نہیں

درد کی مضراب خدا حیف میسّر نہ ہوئی
پُرزِ نوا دل کا مرا ساز نو بے تار نہیں

دیمک بے راہ روی چاٹ گئی قلب مرا
جانِ سلیمان گئی لوگ خبردار نہیں

جلوۂ حق چار طرف ہے اَدِنی کیسے کہوں
ذوق نظر چشم دروں طاقتِ دیدار نہیں

موت ہو ایسی کہ کہیں لوگ زبیرؔ آج تجھے
رزق طلب زیست ملی غسل بھی درکار نہیں

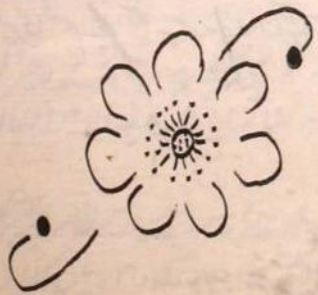

جینے کی سعی مشکور نہیں
مرنا بھی مگر منظور نہیں

ارمان ہے لغو احساس تو ہے
پر شیشہ ارماں چور نہیں

غم سے تو ہوں کوسوں دور مگر
یوں دیکھئے تو مسرور نہیں

ہے فکر میں ساری ایک خلا
تفکیر اگرچہ کور نہیں

ہے قلب مرا فردوس بریں
افسوس کہ اس میں حور نہیں

ہے فوجِ سلیمان چار طرف
کمزور کا شاہ مور نہیں

ہے برق تجلی اب بھی وہی
پر دل ہی زبیر اب طور نہیں

کہتے تو ان کے مجموعۂ کلام کا حجم دیوانِ شمس تبریز سے کم کیا ہوتا!

ان کے کلام بلاغت نظام کو دیکھ کر پہلا تاثر تو یہ قائم ہوتا ہے کہ ابوالکلامی نثر کی طرح اگر کوئی ابوالکلامی شاعری ہو سکتی ہے تو وہ اس کے امام ہیں۔

ع ' رنگ بیدل میں ریختہ کہنا ' مباح ہے۔ اگر اس رنگ پر اپنا رنگ غالب لانے کی استعداد پیدا کی جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ زبیر کے یہاں شعر گوئی کا شغف نہ تخیل کی طاقت کے اعتبار سے پیدا ہوا، نہ اردو شاعری کی روایت کے شعور سے۔ بلکہ جو کچھ ہوا وہ صرف عربی اور فارسی کے زور پر ہوا۔ ان کے یہاں اردو روزمرّہ اور محاورۂ فارسی کا فشار محسوس کرتا ہے اور کشادگی سے سانس نہیں لے سکتا۔

بات دراصل یہ ہے کہ شاعری زبیر کا ثانوی مشغلہ تھا اور ہے۔ ان کی بنیادی دلچسپیاں تاریخ و تحقیق اور عربی، فارسی زبانوں کے حصولِ علم میں رہی ہیں۔ اردو شاعری کا مطالعہ بھی زبیر نے بطور ایک عالم کے کیا بطور ایک شاعر کے نہیں۔ زبان کے رنگ و آہنگ کو انھوں نے اس طرح نہیں پہچانا جیسا کہ حسن کا اداشناس فنکار پہچانتا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ زبیر عروض داں ہیں اور اپنی شاعری کے عروضی نظام میں انھوں نے چند نمایاں اجتہادات بھی کیے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں تھرکتی، گونجتی، گنگناتی، بحروں کی جگہ ایسے اوزان کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ جو مفکرانہ اور اخلاقی شاعری میں عموماً دیکھنے ملتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہو کہ ان کا خاص طرزِ سخن، مضمون آفرینی، معنی آفرینی، تجنیسِ معنوی اور لفظی سے ترکیب پایا ہے۔ قرآنی و اسلامی تلمیحات کا بھی وہ نہایت وافر پیمانہ پر استعمال کرتے ہیں۔ اور اکثر ایسی تلمیحات سے کام لیتے ہیں جو بہت مانوس نہیں ہیں۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر زبیر کی شاعری اِشکال، ابہام اور اغراق کے دبیز پردوں میں ملفوف نظر آتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبیر کی شاعری کا جھرنا زبان کی سنگلاخ چٹانوں اور بیان کی پُرپیچ جھاڑیوں کے بیچ ہو کر بہتا ہے۔

لیکن اِشکال اور ابہام کی اپنی ایک کشش ہے جو قاری کے جذبۂ تجسّس کو اکساتی ہے۔ سنگلاخ راہوں سے گوہرِ معنی تک پہنچنے اور ابہام کے پردے اٹھا کر حسین خیال سے

پوچھا جو ان سے شرم نہیں کیوں شباب میں
ہنس کر کہا کہ صرف کلی ہے حجاب میں

دار وجود کا نہیں دیّار جز خُدا
ہم لوگ صرف آتے ہیں سائے کے باب میں

صفحات و حرف و لفظ مظاہر ہیں اور بس
مفہوم ساری ایک ہے کن کی کتاب میں

نصف نہار کو جوں سمٹ جائے ظل صبح
رغبت ہے کم جہان سے عین شباب میں

تخلیق دود دل سے کیا آسمان نو
تب جا کے ایک بدر لبا اس سحاب میں

سورج کو دشمنی ہے چراغ سحر کے ساتھ
ہم مسلکانِ نور بھی ہیں پیچ و تاب میں

ذرّہ چمک کے غیر کو روشن نہ کر سکا
دم خم نہیں رہبر عالی جناب میں

سایہ نشین صاحب لولاک ہے زبیر
ہوگا نہ روز حشر کبھی اضطراب میں

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ہو رُعب حسن کم تو قدم کو اُٹھاؤں میں
آپ آئے ہیں تو راہ میں آنکھیں بچھاؤں میں

کل رات دل کے ساتھ ہوا جو معاملہ
ہے راز وہ نہ شعر کہ تم کو سُناؤں میں

سیماب وار ہے یہی بود کشتہ بہ
شاید کہ بعد مرگ کوئی کام آؤں میں

قدموں تلے سے ہو نہ سکا زائل وجُدا
ہوں سایہ جب اُٹھوں کہ تجھی میں سماؤں میں

روندا گیا ہے موج کو ساحل پہ اے خدا
طبع رواں کی موج کی منزل نہ پاؤں میں

ہم رنگ ہو سکے نہ کبھی اہل شاخ و گل
جلب نظر کی خواہش گل کیا بتاؤں میں

بھڑکی ہے اس میں شوق نمائش کی آگ گر
اس ناتوان آہ سے کیسے بجھاؤں میں

بربادیوں پہ کوئی تُلا ہو تو کیا کروں
گرنے سے ایک سایہ کو کیسے بچاؤں میں

آنسوں بہے تو پاؤں تلے شمع کے زبیرؔ
بہکے قدم پہ اشک نہ کیوں کر بہاؤں میں

دُنیائے خیال سے بڑھو تو
آنکھوں میں جگہ ملیگی تم کو
نزہت گہ چشم کو فقط تم
خردار سے ایک مشت سمجھو
کچھ دور ہے اور دیدنی جا
اب سیرِ جنانِ دل کرلو
تقریبِ بہار ہے مرے گھر
کچھ دیر چلیں جو وقت ہو تو
کاشانۂ چشم و دل کی رونق
در اصل تمہیں ہو سچ جو پوچھو
ہمراہ سفر یہ طے ہو باقی
تجویز ہے گر بُرا نہ مانو
در پیش سفر طویل ہے ہم
لیں زاد وفاق ساتھ ٹھہرو
ہیں بد اثرات قرب کے بھی
ہو تاب گشش نہ ماند دیکھو
ہر صبح بناؤ بات تنا ہی
تعمیر زبر زبر زندگی ہو

ہو کنایہ ابلغ اے دلدار تو
سامنے ہو واقفِ اسرار تو

بوئے گل کے واسطے ہے چاک شرط
چاک دل سے بھی کھلا گلزار تو

چاند کی تاویل کس سے پوچھیے
جب ہو یوسف کے لیے دشوار تو

خواب کا مطلب انھیں سے پوچھا
ہو میسر پر مجھے دیدار تو

کب مسیحائی تو کرتے ہیں مگر
ہوں نظر کے اور ہی اطوار تو

ظلم جو کرتا رہا ہے عمر بھر
بن گیا داور کہیں وہ یار تو

پھول سے ہوتا ضرور آراستہ
اور بڑھ کے شاخ بنتا خار تو

راہ طائر آشیاں تک اور تھی
کیا ہوا تھی شاخ ناہموار تو

تحفۃ العینین دل ہے اے زبیر
ہوں نگاہیں یار سے دوچار تو

نگاہ راز داں دے ایسی اس چشم مقلد کو
کہ یہ پہچان لے ہر دم ترے حسن مجدد کو

بتان آذری میں ایک ابراہیم بھی تو تھے
کبھی بیت الصنم نے خود تراشا ہے موحد کو

گواہِ عفتِ مریم صبیٔ شیر خوار آیا
نزاکت مسئلے کی دیکھیے یا عمدِ شاہد کو

شکر رنجی کی وسعت کو سمجھتے ہیں وہ دل جوئی
خلوص دل سے پاس دل بتاتے ہیں وہ اک ضد کو

نظر بیخ شجر آتی ہے جن کو پھل کے اندر ہی
خدا کے فضل سے پا جائیں گے جلد ہی مقاصد کو

جو پہنچی بام چشم یار تک تو جھک گئیں نظریں
سکھائے بارگاہِ حسن کے آداب قاصد کو

مٹایا نقش جس کا دل سے اس کی یاد باقی ہے
زبیدؔ اب وہ مٹا سکتے نہیں اک حرف زائد کو

دیکھ لیں حسن ذی شان کو
گر حواس آئیں احسان کو

کیا تصور مجسّم ہوا
جانتا ہوں اس انجان کو

جب کسی سے توقع نہیں
کیا کریں تیرے پیمان کو

کب نہیں ہم تیرے منتظر
چھوڑا اس عہد بے جان کو

کافرہ یہ جوانی تری
راس آئے گی ایمان کو

یہ خلش، نقش پا جس کی ہے
ڈھونڈیے ایسے پیکان کو

پھر بغیر ان کے آئی زبید
دیکھ شام پشیمان کو

اشک موجود ہیں بہانے کو
ساتھ لے آئے ہیں بہانے کو

پھول سے چاک شمع سے آتش
چاند سے داغ لائے لانے کو

روٹھنے کے سکھا کے آئے چلن
ہم چلے تھے انھیں منانے کو

رُخ نہ جل جائے گرم آنسو سے
انگلیاں ہیں مری جلانے کو

سر بہ سینہ رہو نہیں آہٹ
دھڑکنیں دل کی ہیں سنانے کو

چاہتے ہیں خود آئیں روزانہ
لب پہ انکار ہے بتانے کو

داستاں میں شریک ہو پھر بھی
بے خبر ہو گئے ستانے کو

حسن بے ساختہ زبیر اچھا
غازہ لائے ہو دل دکھانے کو

ستم کر کے بھی آنکھوں میں نمی ہے
خدایا ہو تو ایسی سادگی ہو

فسانے میں مرے رہتے ہوئے بھی
حقیقت کی طرح تم اجنبی ہو

نہ آتے وقت ہے پاؤں کی آہٹ
نہ نقشِ پا ہی پیچھے چھوڑتی ہو

ہوائیں جس طرح غنچوں میں پھونکیں
دلوں میں روح تم یوں پھونکتی ہو

نظر بن کر تم آنکھوں میں سمائیں
وہی دیکھوں میں جو تم دیکھتی ہو

نشیمن ہی ہے میرا مشتِ گل پر
عجب کیا اس میں شکلِ گل چھپی ہو

اُمنڈ آیا ہے آنکھوں میں سمندر
سبب شاید کشش اس ماہ کی ہو

زبیرؔ ان کو دکھائیں حال دل کیا
جب استغنا ہی شانِ دلبری ہو

جدھر دیکھو ہجوم والہانہ
مبارک ہو مزاج دلبرانہ
شبابِ حُسن سے کیوں کر کرم ہو
دوپہری وقت کا چھوٹا ہے سایہ
مجھے سودائی و بیگانہ سمجھا
سبحان اللہ تجاہل عارفانہ
تری مشاطگی میں رنگ بھر دوں
کروں پلکوں سے ان زلفوں میں شانہ
ذرا بچ کر انھیں پردے سے دیکھا
یہ آنکھیں موند لینا تھا بہانہ
ہوں شیدائی محبوب سماعی
تعارف اب تلک ہے غائبانہ
مرے مولا مجھے مجھ سے چھڑا دے
کہ مل جائے مجھے تیرا ٹھکانہ
گریزاں تیرا اپنے آپ سے ہے
ملا تب جا کر اسکو اک نشانہ
زبیر آنسو نہیں اجزائے دل ہیں
مکیں کا عکس کہتا ہے فسانہ

لطف اندوز ہونے کا اپنا ایک لطف ہے۔

لیکن زبیر کے سامنے ایک کٹھن راہ ہے۔ اگر وہ شاعری کی راہ پر گامزن رہنا چاہتے ہیں تو انھیں آسان گوئی کی طرف مائل ہونا پڑے گا۔ جو میں جانتا ہوں ان کے لیے دشوار کام ہے۔ لیکن بڑی شاعری احساس اور تخیل کی نزاکت سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کی دبازت سے نہیں۔ ان کے اندر جو ایک عالم السنہ اور معلّم اخلاق چھپا ہوا ہے اس کی جگہ زبان کا مزاج داں اور زندگی کا رازداں پیدا کرنا ہوگا۔ تبھی ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا صحیح نتیجہ سامنے آئے گا۔

- وارث علوی

احمد آباد

۱۷ رمضان المبارک سنہ ۱۴۱۵ھ

پائے سودا میں گو زنجیر خرد پہنائی
کم مگر ہو نہ سکی اس کے لیے پہنائی

چار تکبیر کو میں فرض کفایہ سمجھا
بارہا مر کے مرے سامنے دُنیا آئی

چین سے گوشہ نشین بھی تو نہیں ہو سکتا
بیٹھے بیٹھے لیے پھرتی ہے مجھے تنہائی

حسن مسجود مہ و مہر و کواکب ہے ترا
چاند تاروں سے بھی آگے ہے تری گہرائی

دیکھئے چشم زدن میں یہ کہاں تک پہنچی
سرعتِ سیر میں مشہور ہوئی رسوائی

ایک نکتہ جو سمجھ جاؤ تو اچھا ہوگا
نکتہ چینی تو بہر حال نہیں گہرائی

ہوگیا پھر سے کوئی آج تصور پیما
طینتاً تھا ہی زبیر اور ہوا صحرائی

اُبھری ہے مرے سامنے تصویر ادھوری
تخئیل میں پیدا ہوئی تشویر ادھوری

خوابوں میں بھی ہوتا نہیں اب چین میسّر
اس طرح رہی خواب کی تعبیر ادھوری

محسوس ہوئی تیرگی کچھ اور زیادہ
اک پل کی تجلّی سے ہے تنویر ادھوری

ہاتھوں کی لکیریں بھی پس واقعہ اُبھریں
قسمت میں یہ مشکل ہوئی تغییر ادھوری

پتھر میں چھپی آگ بجھاتا نہیں پانی
دِل غرق ہے اشکوں میں پہ تاثیر ادھوری

اشکال میں مضمر ہی ہے نور رہ منزل
تاریکیاں کہتی ہیں، ہے تنویر ادھوری

اک لوح شکستہ پہ قلمداں ہیں یہ آنکھیں
اُٹھنے نہ دو رہ جائے نہ تحریر ادھوری

گو شمع جلاتی ہے اُسے اشک بہاکر
پروانے کی رہتی ہے یہ تعزیر ادھوری

بستا ہے زبیرؔ اک صنم مرے بھی دل میں
تاہم رہی ویرانے کی تعمیر ادھوری

جب نہ سیدھا ہو سکا دنیا ترا محور کبھی
اہلِ دنیا سے توقع ہی نہیں جز شر کبھی

ڈھونڈ لے تاریکیوں میں بھی حیاتِ جاوداں
خضر نے ظلمات ہی میں لب کیے تھے تر کبھی

ڈوب کر موقع دیا سورج نے شمعِ ہیچ کو
ماتحت کے دل شکن ہوتے نہیں مہتر کبھی

خیر امت میں ہوئی تحریف مانندِ صحف
کاش ہو شرمندۂ تجدید یہ دفتر کبھی

مری آنکھوں میں تصور زندگانی کا پھرا
دائرہ جب بھی بنا ہے کوئی پانی پر کبھی

دور تو پہلو سے کرتے ہو مگر یہ سوچ لو
کیا شرر جیتی ہے شعلہ سے جدا ہو کر کبھی

اُگتا رہتا ہے سبزہ رہ گزر کو چھوڑ کر
صلح کیشی ضعف کی خاطر میں لائے پر کبھی

عمر نے باندھے ہیں جالے روز و شب کے ارد گرد
آپ ویرانی کا میری دیکھئے منظر کبھی

سانپ پیچ و تاب کھا کھا کر یہ کہتا ہے زبیر
اٹھ نہیں سکتے زمین سے ڈنک کے خوگر کبھی

25757

بڑی مشکلوں سے جا کر مری بات کچھ بنی تھی
یہ جواب دیتے دیتے انھیں آ گئی ہنسی تھی

لب غنچہ پھر سے ہلتے تو نہ راز راز رہتا
یہ کلی کسی سے شاید کوئی بات کہہ رہی تھی

یہ بتا رہا ہے مل کر سر مطلب آ نہ سکتا
قدم اٹھ چکے ہیں بے شک یہ زباں نہ اٹھ سکی تھی

ترے حسن پر قصیدہ نہ گیا ورائے تشبیب
نہ گریز لا سکے ہم یہ عجیب بے بسی تھی

مری چشم تشنۂ دید بھی مسیح دی انھوں نے
وہ بدیر آئے اس پر عجب ان کی دل لگی تھی

انھیں دور ہوں تو تکتا ہوں قریب وہ تو جھکنا
وہ جسارت نگہ تھی یہ نگہ کی بندگی تھی کمی

وہ بشرم و سہم آئے وہ زبر زبر میری لرزش
وہ جہاں نیا نیا تھا وہ فضا نئی نئی تھی

ہوئے ہیں ہوش پراں، منتشر جذبات کیا کرتے
نہیں ہیں مجتمع خود ہم تمہیں کیا ہم لوا کرتے
حضور حسن چلتا ہے کہاں سکہ شکایت کا
نہ ہو جب دولت دل اور کیا ہم بینوا کرتے
سمجھتے ہیں کہ ہوتا ہے ہمیشہ حسن حیلہ جو
ہماری طبع دلجو دیکھ کر تم اور کیا کرتے
تمہارے دشمنوں کی تھی طبیعت کل اگر ناسازنہ
کہا ہوتا بتِ مومن تو ہم بھی کچھ دعا کرتے
خبر کیا تھی حنائے دلبستہ یوں بھی رنگ لائے گی
شکستہ پائی کا ورنہ بلا گرداں ادا کرتے
نہیں اے سرو قد اس راستی پر کجروی اچھی
نہ کرنی تھی اگر ہم سے تم اپنے سے وفا کرتے
~~زباں کے زخم سے ہے بڑھ کے آواز شیریں کا~~
دگرنہ کیوں کھڑے مدہوش تیری ہم سنا کرتے
مقام حسن دیگر ہے مقام دلبری دیگر
تمہیں کہ دو حسیں رہنے پہ کیا تم اکتفا کرتے
حسیں سے دل ربا تم کو بنایا دے کے دل ہم نے
صنم ہم سے تو آخر ایک عہد بپا کرتے
گل خنداں نے بانہیں پنکھڑی کی کھول دیں آخر
زہے آغوش میں کیا اور عرضِ مدعا کرتے

زبان کے زخم پر چھا جاتے ہیں شیریں آواز

برق کے لیے دل میں آستاں بنا بیٹھے
آشیاں کے اندر ہی آشیاں بنا بیٹھے

پاس دو گھڑی بیٹھے کیا کیا خدا جانے
ایک بے زباں دل کو ہم زباں بنا بیٹھے

عمر بھر خموشی کا عہد کر لیا تھا پر
کیا ہوا کہ ان کو ہم راز داں بنا بیٹھے

پا چکا ہوں میں منزل وہ ابھی مسافر ہیں
ایک دوسرے کو پر ہم عناں بنا بیٹھے

چاہتے تھے دل میں جو ہم انھیں کہیں اپنا
اتفاق سے ان کو مہرباں بنا بیٹھے

ہیں مرے تصوّر میں جا بجا دمِ اطلال
ایک ہم نشیں پا کر کارواں بنا بیٹھے

ساتھ آسماں کم تھے اے فلک نشیں ہمدم
کیوں زبیر کو آخر آسماں بنا بیٹھے

·+·

کچھ حضیض لا سے باہر لا مجھے
اوج الا اللہ تک پہنچا مجھے

نقش افتادہ کو ہے حکم سفر
جانبِ نقاش ہے جانا مجھے

زندگی تیز رو آگے بڑھی
چھوڑ کر مانندِ نقشِ پا مجھے

روزِ محشر تھی ندامت کس قدر
غم خدا کے سامنے کا تھا مجھے

جاں نثاری ان سے پر سیکھے کوئی
آنسوؤں نے گر کے خود تھاما مجھے

اے نگاہِ یار تیرا شکریہ
تو نے دزدیدہ سہی دیکھا مجھے

آرزوئیں تشنہ شدت رہیں
تشنگی نے تشنہ پھر چھوڑا مجھے

سیر تھا طفلِ اجل ہر چند پر
اس کی نادانی نے تڑپایا مجھے

اک متاعِ خام ہوں لیکن زبیر
شرف ہے پختہ کی صحبت کا مجھے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اے عشق اب تو باز آ وعدہ نما حسیں سے
دیروز کہہ رہا ہے کیا پھر مُراد کل سے

اضداد میں کشش ہے اضداد سے تعارف
غفران و معصیت میں اک ربط ہے ازل سے

راوی حسن ہوں میں ہے عشق نام میرا
حق گوی معتبر ہوں ڈرتا نہیں اجل سے

رکھتا ہوں حسن سے میں اک حسن ظن ہمیشہ
کاغذ کے پیرہن سے نفرت رہی ازل سے

بُلبل تو قافیہ ہے تو میں ردیف گل ہوں
یہ بعد فطرتی ہے کیا فائدہ جدل سے

باقی جلی ہے پاکر پروانہ دور رہ کر
اے شمع تیرا آخر کچھ جوڑ بھی ہے حل سے

کچھ اشک اضطراری کچھ اشک آئیں شکراً
ہوتی ہے برق پیدا اے آنکھ ایسے جل سے

حالاتِ دہر سے ہے بس الاماں زبیرؔ اب
اللہ مجھ کو رکھے محفوظ تر کنول سے

آنے سے اُن کو روک دیا کچھ حجاب نے
ساتھ اس طرف کا دیا نہ مرے اضطراب نے

ہیں وقت تو نہیں کہ نہ دیکھوں کسی کی راہ
مایوس گرچہ کر دیا ان کے جواب نے

کوشش یہ چار گام بھی تھے کس قدر گراں
پہنچا دیا کہاں نگہہ انتخاب نے

بخشا مری نگاہ نے اک حسن پر کہا
ھل من مزید اس پہ ترے پیچ و تاب نے

یہ عشق ہے وہ آگ جو ہوتی نہیں فرو
دی قرب نے ہوا اسے گہ اجتناب نے

اظہار حال کے لیے جب لفظ مل گئے
تو روح پھونکنے نہ دی انمیں حجاب نے

نظریں ملا کے موت کا ساماں بہم کیا
بے حرف و صوت کے سخن مستطاب نے

مصرف نہیں ہے سقف بلند فلک کا کچھ
کس رُت میں آسرا دیا رفعت مآب نے

ہے کرۂ حیات کا محور اگرچہ زیر
باندھا مدار جاگتی آنکھوں کے خواب نے

تشکّر

اُردو اکادمی گجرات کا اس کے جزوی مالی تعاون کے لیے ممنون ہوں۔

میرے طلبہ اقبال شیخ، کمال الدّین قریشی، صادق انصاری، وفا جونپوری، نثار احمد کیرد سین والے، یٰسین شیخ اور لیکچرر محترمہ چاند بی بی صاحبہ کا ممنون ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر اس مجموعہ کی اشاعت میرے لیے مشکل تھی۔

محترم استاد وارث علوی صاحب نے بطیب خاطر پیش لفظ لکھنا قبول کرکے شرف بخشا۔ ان کا بھی میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

محمد بیر لسی

احمد آباد
۱۷، رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ

دل کسی دل کا طلبگار ہوا جاتا ہے
عشق کے در کا گنہگار ہوا جاتا ہے

دیکھئے جاکے کہاں شوق عبادت جاگا
ایک بُت ہے کہ پرستار ہوا جاتا ہے

عشق انگڑائیاں لیتا ہے ابھی تو تاہم
پا بگل سرو بہ رفتار ہوا جاتا ہے

جرم ناکردہ میں جاری ہے ابھی قید حیات
بے قصور اور گنہگار ہوا جاتا ہے

اُن کو قسمت سے ملا قلب پریشاں ایسا
جو خود اپنے ہی سے بیزار ہوا جاتا ہے

پرسش حال پہ کہتے ہیں کریدو تو مت
بدگماں اور وہ بیمار ہوا جاتا ہے

نام کا تیرے اثر صورت و سیرت میں ہے
بے سبب برسر پیکار ہوا جاتا ہے

روز اوّل سے زبیرؔ آن کے لیے میرا وجود
دن بدن باعثِ آزار ہوا جاتا ہے

گوشہ نشین ہوں روش ترکِ تعلقات ہے
گوشۂ چشمِ یار ہی زاویہ حیات ہے

چاک جنوں سے ہو گیا آتشِ عشق سے ہے سُرخ
منکرِ الفت اب بھی گر گل ہو تو اور بات ہے

دل میں ہزار ہا خیال آئے گئے مگر صنم
ترے خیال دل نشیں ہی کو بس اک ثبات ہے

حیف خدا پرست ہوں میں نہ صنم پرست ہوں
آذرِ خود تراش ہوں ذات مری منات ہے

جب سے نزولِ مصحفِ حسن ہوا ہے قلب
وحی نگاہ دم بہ دم نور ہی شش جہات ہے

لاکھ بتوں سے ربط ہے آنکھ تلک ملائی پر
تہمتِ بدگمان سے آئینہ کو نجات ہے

وضعِ جہاں تو اک ہی طرزِ کہن پہ ہے سدا
حالِ درونِ دل سے ہی صبغتِ کائنات ہے

خیر ہو ہدہدِ خیال آج کہیں نہیں دکھا
گر نبا سبا ملے داخلِ ممکنات ہے

معتکف ایک صنم ہوا دل کے حرم میں اے زبیر
حلقہ بگوش عشق دل موردِ التفات ہے

معتکف اک

یہ حسرتِ دیرینہ کے اطلال مرا دل ہے
یہ بیش بہا گلشن آمال مرا دل ہے
گنجائشِ معبود نکل آئے یہ وسعت ہے
اپنوں پہ کبھی تنگ بہر حال مرا دل ہے
گو نیک خیالات سے معمور ہے پھر بھی
شیطان کے قدموں تلے پامال مرا دل ہے
مائل بہ مسبّب ہے گر اسباب گزیدہ ہو
اسباب جو مل جائیں تو محتال مرا دل ہے
گنجینۂ اسرارِ الٰہی کا محافظ ہے
افشار پہ اتر آئے تو غربال مرا دل ہے
مشتاق غم و تختۂ نو مشق خوشی کا
پیری میں بھی بازیچۂ اطفال مرا دل ہے
ہو خواب کہ بیداری کلام اسکی ہے عادت
بس بارگہِ حسن ہی میں لال مرا دل ہے
لمبا تو بہت عشق کا قصہ ہے زبیرؔ اپنا
لیکن اسی تفصیل کی اجمال مرا دل

جواں ہو کر حسین کو حکمرانی آہی جاتی ہے
کمند زلف کو بھی پاسبانی آہی جاتی ہے

ہوئے بے سود سب شکوہ جواز آں غزل سنکر
اجی تکلیف میں تو بدگمانی آہی جاتی ہے

مری کچھ تلخ باتیں سن کے ارشاد گرامی تھا
بہ حال یاس یوں آتش بیانی آہی جاتی ہے

ستم سہہ کر رہا چپ تو لگے تن کر وہ یوں کہنے
خطا کاروں کو اکثر بے زبانی آہی جاتی ہے

تبسم پر مرے تھا تبصرہ بے اعتنائی سے
ہو خوش فہمی تو لب کو گل فشانی آہی جاتی ہے

صدائے قُم باذنِ اللہ سنیں گے کشتگان عشق
مسیحا ہیں وہ انکو مہربانی آہی جاتی ہے

زبیر اصرار مت کرنا بہت دیدار کا ورنہ
صنم کو بھی تو آخر لن ترانی آہی جاتی ہے

بھلا اشک بہانے سے کوئی بات بنی ہے
اُبلتے ہوئے پانی سے کہیں آگ لگی ہے

ہوئی غنچہ و گلشن میں کبھی قید نہ خوشبو
کہیں خواہش آزادی احرار دبی ہے

نظر ملتے ہی ان سے دل محتاط یہ بولا
ان آنکھوں نے مرے قتل کی بنیاد رکھی ہے

یہ تحسین باکراہ، حسد اور عداوت
مری بات ضرور آپ کی آنکھوں میں جچی ہے

ادھر عشق شرر بار اُدھر محتسب خشک
ابھی دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ لگی ہے

زبیرؔ ایک دفعہ مقتدی آجائیں تو چلدیں
اذان اور اقامت کی صدا آہی رہی ہے

+

حقیقت پہ پڑتے ہیں خوابوں کے سایے
کھلی آنکھ دیکھا اچانک، وہ آئے

عیاں پھر عیاں ہے کوئی کیا بتائے
ترے ہجر کے عہد کیسے بتائے

بھٹکتی ہے منزل مرے ساتھ حیراں
محبّت کی رہ میں قدم کو اٹھائے

ہوا ساغرِ چشم سے حال لبریز
کھڑے ہو اگرچہ نظر کو جُھکائے

دکھانا نہ منظور ہو جس کو چہرہ
وہ شفاف ہاتھوں سے منہ کو چُھپائے

دوپٹہ لپیٹا ہے کیوں انگلیوں پر
پتہ کیا نہیں چوٹ دل پہ ہو کھائے

نگاہوں کی باتوں میں کیا وہ مخل تھا
عتاباً ہو دانتوں میں لب یہ دبائے

خفا میری حرکت پہ جو ہو رہا تھو
وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کیوں مسکرائے

جسے کوئی دزدیدہ نظروں سے دیکھے
زبیر آخرش وہ کہاں چین پائے

○

اصول سایۂ پا ہیں ہر اک قوی کے لیے
مگر ہیں آہنی زنجیر بے بسی کے لیے

ہوا جو چاک بھی بدخواہ سے تو پیچھے سے
یہ ہے ثبوت مرا پاک دامنی کے لیے

نقوشِ پا کو کیا مسخ پائے پیروں نے
اگرچہ نقش بنے ہی تھے پیروی کے لیے

وسیع ملک سلیمان و دولت قاروں
کوئی بھی شے نہیں دنیا میں دلکشی کے لیے

دُعا کا ظرف تو ہے تنگ عطا تو خود کچھ کر
کسی نے تجھ سے دُعا کی پیمبری کے لیے ؟

سناوری بھی ہے مشکل تو ڈوبنا مشکل
ہوں بحرِ غم میں گھرا دُرِّ زندگی کے لیے

حسد کی آگ سے ایندھن دیا ہے یاروں نے
اُٹھا ہوں جب بھی میں پرواز برتری کیلئے

سجا ہے لعبتِ افکار سے زبیدؔ جہاں
جگہ رہی نہ مگر پائے مشتری کے لیے

قطعات وغیرہ

اجنبی

دل حزیں کو زمانے نے اس طرح توڑا
شکستہ حرف کی مانند پھر پڑھا نہ گیا
دلِ شکستہ میں ہموار عکس ابھریں کیوں
بغیر صید تذبذب ہوئے رہا نہ گیا
جگہ بنی بھی ہے لوگوں کے دل میں اکثر تو
کسی نے پاس بلایا گیا، گیا نہ گیا
کسی سے انس و تعلق کو دل نے چاہا بھی
قریب جا نہ سکا پاس آ کہا نہ گیا
بھرے جہان میں رہتا ہوں اجنبی کی طرح
نگاہ جلب کی شیر و شکر ہوا نہ گیا
بہ اعتبار خیال و طبع بھی تنہا ہوں
زبان ہوتے ہوئے شمع سے جلا نہ گیا
کسی سے مجھ کو عداوت ہو اے معاذاللہ
یہ سچ ہے مجھ سے مگر دوست بھی بنایا نہ گیا
چلے ہے ساتھ جو روشن ضمیر چاند سا ہو
کسی کے ساتھ منافق کبھی چلا نہ گیا
ہر ایک فرد جہاں ہے عبارت ایک مغلق
زبیرؔ سے تو معمہ یہ حل کیا نہ گیا

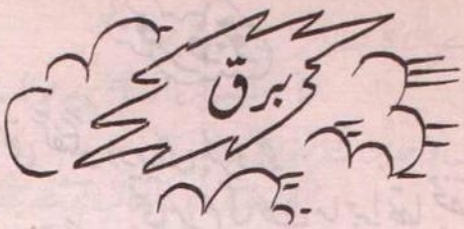

پینے کے لیے ہر بار جب بھی رات کو چمکی
چراغ آخرِ شب کی طرح بجلی نے دم توڑا
نہیں لطفِ عمیم خور کہ ہو مشمول ذرّہ تک
ہے لطفِ برق آنا" اتفاقاً" چند نے پایا
بہاتا ہے فلک آنسو کہ پھر جشن چراغاں ہو
جلائیں بجلیاں لاکھوں نہ چمکا ایک بھی تارا
قمر ہو برق ہو خورشید ہو یا کوکبِ تاباں
کسی کی بھی شعاعوں سے دیا گھر کا نہیں جلتا
تگ و دو بے قراری و شبِ تار اور یہ آنسو
فلک کے منظرہ میں انتظار اے برق ہے کسکا
خدا دے استدامت برق تیرے اس تبسّم کو
میسّر ہو تجھے اس کے حسیں لب میں سما جانا
یہ نشورِ رعد ہے جس نے جگایا برق خفتہ کو
تلاش آما جگاہ کی ہے کہ تا حدِّ نظر دیکھا
زبیرؔ انسان کی ہستی حیات برق ہے گویا
عدم خانہ ذرا چمکا نہ چمکا اور اندھیرا تھا

(۱)

نعت

ٹوٹی جو طناب اہل دید جہاں میں
اٹھوں گا لئے حشر میں سودائے مدینہ
بے تابی و شوق اور تخیل کا ہر اک پل
اک قافلہ ہوتا ہے رہ پیمائے مدینہ
شرمندگی عصیاں کی مانع بھی ہے لیکن
زہ تیری جسارت کو تمنائے مدینہ
بے آسرا ہے امتِ مرحوم جہاں میں
سن لیجئے اے ملجا و ماوائے مدینہ
آرام میں ان کے نہ خلل آئے وزش سے
ہو شرط جو منظور صبا جائے مدینہ
مستغفرِ عصیاں کیلئے آپ بھی ایکبار
کہہ دیجئے اغفرلہٗ آقائے مدینہ
بیمار نیستاں ہے زبیرؔ آہ بھرے گا
در اصل ہے دور اصل سے یہ نائے مدینہ

بحر و جو

ہو رہی تھی گفتگو درمیان بحر و جو
تھی مراسم کی بحث ماجرا تھا مختصر
خشک سالی تشنگی چھا گئی تھی چار سو
پر سحاب ابر چھاتا نہ آتا تھا نظر
ایک قطرہ تک نہ تھا جوئے تشنہ کیلئے
بحر بے پایاں مگر موجزن مستی بہ سر
تھا مسلسل سالہا سال سے سب کچھ دیا
جسکو اس نے بحر بالکل گیا تھا وہ مکر
صحبت دیرینہ ملحوظ تھی نہ جنسیت
نقش ہو بر آب جوں نقش تھا جو بر حجر
وصل کی راحت جو تھی وجہ فخر و تمکنت
جس کی خاطر طے کیا اس نے اک لمبا سفر
بے رخی بحر نے کچھ پاس نہ اس کا کیا
وہ ہی راحت اسلئے ہو گئی تھی دردسر
آرزوئے قرب برتر قریب مرگ تھی
تھی رگ جوئے رواں خون دیگر منکسر
ماحصل اخبات کا ہے اسے احساس تھا
رفعت فطری گنوائی شہزادی نے مگر
وقت آنے پر کھلا راز ربط دانیت
جز کفاءت دوستی لغو شے ہے بے خبر

ترے پانی کا بھلا بحر کب محتاج تھا
حاشیہ بردار ساحل یہ بولا بے خطر

صف واحد بن گئے فضلہ خوار و عیب جو
مثل ساحل لب کشا لب ہوئے تھے جنکے تر

دیکھ کر معتوب سب کو دلیری آگئی
شعلہ جوالہ تھی بغض خفتہ کی شرر

اتفاق بحر تھا مفقود قدر مشترک!
عاتب و مغضوب تھے اسکے دل میں محتقر

باوجود اپنی تنک کے مانگی پانی دیا
کھیت کو کاریز کو تشنگی کو عمر بھر

آج وہ مخذول تھی اور محاسن محتجب
صرف خاموشی ہی پر رہ گئی تھی مقتدر

بے کرانی بحر کی دیدنی تھی اور بس
کچھ نہ کرنے پر بھی جو ہو گئی تھی مشتہر

کی اسی کے عضو نے اس سے جنگ زرگری
بحر سے ملحق رہا اس کو تھی اُمید بر

وقت طغیانی و مد شور تھا اس کا دہن
مل گیا اشراف کا اپنوں سے کٹنے کا ثمر

آب عذب جوئے نے گم کی اپنی خو و بو
پر پشیمانی کہاں اس پہ تھا وہ مفتخر

اصل سے ہو کر جدا تھا عذوبت کھو چکا
ہو گیا تھا عرق و خون جاذب بحر محتکر

لاکھ کہتی ہے فلاخن بدل دی ماہیت
راکھ ہو یا آگ ہو جسکا ہو اس میں گذر

پر جتن باطل ہوئے کوششیں عاطل ہوئیں
حوصلوں پر اوس ہے عزم آہن دیکھکر
گرم ہو تو آگ ہے سرد ہو تو پھر وہی
نا میسّر ہو سکی جلنس آہن پر ظفر
کاش پانی بھی مرا یونہی رہتا مستقل
وصل میں بھی فرق کی زندگی کرتا بسر
اب مآل شبنم و خور نظر میں پھر گیا
دوسرے حامی دکھے تو بتوں لگے منتظر
تھی جبینِ بحر پر اب تو لہروں کی شکن
با زبانِ موج کی سرزنش دل کھول کر
شکوہ سنجی چھوڑ دے یاد کر احساں مرا
سینہ کوبی کا تری کچھ نہیں مجھ پر اثر
دشت و صحرا میں پریشاں و سرگشتہ تھی تو
مقصد ہستی دیا میں نے تجھ کو بے بصر
گر نہ میری آرزو تجھ کو لے آغوش میں
کوہ سے گر کر رہیں عضو تیرے منتشر
بیکسوں کا درد و غم کب رہا ہے معتنا
کیا بگاڑے گا مرا اس سا کوئی بے ضرر
سوچ کر یوں بحر نے سخت لہجے میں کہا
یہ سے مجھے نالاں ہے اگر ڈھونڈے اپنا مفر
لوگ اپنے شاہ کے ہیں رو مداح ہیں
ابتغائے عزت ان سے ہے رسم مستمر
جو ایس اللہ بکاف نہیں ہے جانتا
ہو کے رہتا ہے وہ غافل گدائے در بدر

قطرۂ بارش نے جب حفظ کی اپنی خودی
بحر میں پل کے بھی وہ ایک موتی ہے نڈر
مسکنِ افلاک سے فطرتِ بالغ نے
اِھبطو مصراً کہا اور پھینکا فرش پر
عظمتِ رفتہ ولی پھر بھی دامن گیر تھی
تھی ہوس مافات کی اور اصالت مستتر
خویشتن داری رہی بحر کے الطاف سے
تا عمر دیتے رہے درس استغناد درر
اک مقام ارجمند کر کے پیدا دم لیا
بحر ان کا مرتھن ان کی سرزنش بیشتر
میں رفیع المجری ہوں کو کی پروردہ ہو
انفرادیت مری کیوں ہو قربان دگر
جب تلک ہے دم میں دم غیر کے آگے بھلا
کیوں سر تسلیم خم ہو مثالِ جانور
گوشہ اصداف مانند گوہر نا سہی
انزاوا زیر زمیں ہو گا مرا مستقر
شور تھا احباب میں خود کشی ہے کس نے کی
بحر کہتا تھا یہ ہے مجھ سے کٹنے کا ثمر
ایک چشمہ اور بھی مل گیا زیر زمین
ہادی و مرشد رفیق طریق و ہم سفر
مرہم راحت جراحت پہ اس نے یوں رکھا
استفادہ حال سے ہے ہمیں پر منحصر
یہ حوادث زینہ درجہ ما بعد ھیں
غور سے دیکھے اگر خیر رب کا مفتقر

یہ تصادم یہ موانع غبار راہ صفیں
علینک ہے چارگی باعث مسنخِ صور
نامساعد عہار بھی حامل برکت ہی ہے
کر تمتع ذی فہم باثبات مُضطبر
گردش ایام جز مکتب اے ناداں نہیں
ابجد آلام پڑھ ہے یہی پہلی سطر
آکل و ماکول کا سلسلہ دُنیا میں ہے
ہر قوی کمزور سے مستفید و بہرہ ور
خلق باطل کا تصور تلک ممکن نہیں
مصرف ہر شئے تعین ہوا ہے پیشتر
ہے بیک وقت ایک شئے غالب و مغلوب بھی
بر سمِا دہر ہے صلح ہو جائے اگر
نفع بخش خلق شئے ہی کو ہے حق سے بقا
نفع مجھ کو نا سہی تو مگر اقرار کر
حِکمت رب زہر ہے پی مگر ہے دغدغہ
قم باذن اللہ تک کہہ سکے یہ چارہ گر
ابتلاء رب بجز التفات رب نہیں
مستثنیٰ اس سے نہیں کوئی بھی پیغام بر
یُسر کا خورشید ہے عُسر کی ہر شب لیے
خواب کی لذت نہ کھو مطمئن رہ رجبر
انقطاع اسباب سے تا مسبب لے گیا
ہو گئی اَلْیاسَ حِمْا فِی اَیدِی النّاسِ زر
واقعہ چھوٹا سا سہی پر اہم ہے لا جرم
میرے نزدیک اے زبیر اسمیں پوشیدہ عبر

پردہ

مرے گھر کا پردہ مرا تھا مخاطب
کہ تو بن گیا کب سے میرا مقرب
ترا سدرۃ المنتہیٰ اور ہے کیا
سرِ مو قدم در سے آگے نہ رکھنا
یہ آویختگی ہی ترا منتہا ہے
یہ تیری ترقی ترا مدعا ہے
ترا منصبی فرض ہے پردہ داری
مگر جو جگہ دے تجھے بس اسی کی
تری آڑ سے صاحبِ خانہ ہر دم
کرے خواہ کچھ بھی تجھے کیوں ہو پیہم
بظاہر ترا رخ نہایت حسیں ہے
پسِ پردہ لیکن یہ ویسا نہیں ہے
اِدھر سے تماشائی بے ضرر تو
اُدھر سے نمائش فقط بے خبر تو
ہر اک صادر و وارد در سے گویا
یہی ایک جھٹکا مقدر ہے تیرا
مصافحہ عزّت اس کو تو سمجھے
تو ایسی سمجھ بوجھ پر جاؤں صدقے
ترا اصل مایہ یہی دو رُخی ہے
تری جنس ارزاں ازل سے رہی ہے

کہا ہنس کے پردہ نے گر سچ کہوں میں
تری ہی قیادت کا ایک عکس ہوں میں

یہ مرعوبیت اور یہ ذہنی غلامی
تری رہنمائی کی ہے اک نشانی

یہی لوگ پردہ ہیں حاکم کے در پر
ترے اور ان میں حجاب ایک اکبر

طلسمِ تقرب اگر ٹوٹ جائے
مقامِ خود ان کو نظر آپ آئے

زبیر اب بھی پردہ ہے تو بر رُخِ رب
نہیں ہے خدا کا مگر تو مقرب

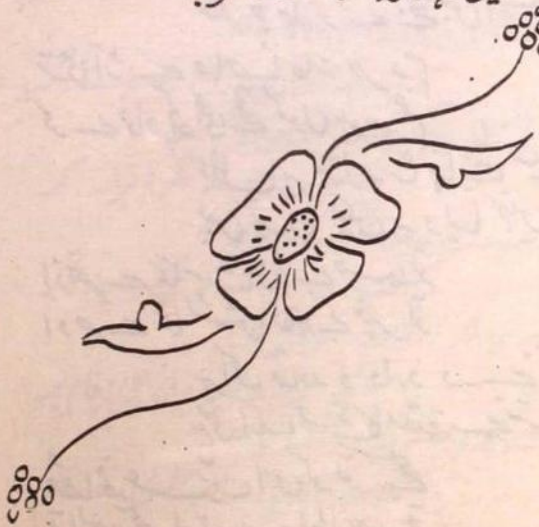

جنگِ ہند و پاک

تنکوں میں چھڑی جنگ عداوت ہے بُری شے
کمزور تھے پر ان کو قوی ساتھ ملا ہے

مغرب کی ہواؤں پہ ادھر ناز تھا اس کو
پُروائی کے کاندھے پہ یہ گر چڑھ کے لڑا ہے

شاطر کے اشارے سے بدلتا ہے پیادہ
یوں راستہ تنکوں نے بھی تبدیل کیا ہے

منزل سے ہوئے دُور ہے مقصود بھی اوجھل
آنکھوں میں پڑی گرد سے اک شور بپا ہے

ہاتھوں میں ہواؤں کے عناں دینے سے پہلے
حالات پہ انگوشت یہ بھی غور کیا ہے؟

بدلیں گی بہت جلد ہوائیں یہ رُخ اپنا
پھر دیکھئے ہر ایک کہاں جا کے گرا ہے

برباد کے معنی ہیں ہواؤں پہ سواری
ان باد سواروں کا ہواؤں کا صلا ہے

کب معنی سمجھی گئی تنکے کی بلندی
کاندھوں کے سہارے سے بڑا کوئی ہوا ہے

بے سود ہے سب تذکرۂ فتح و ہزیمت
تنکوں کی لڑائیوں میں فاتح ہوا ہے

تنکوں کو نہیں چین میسّر کسی کروٹ
کاشانۂ زبیدہ ان کا گذرگاہ ہوا ہے

خاکِ چمن

خاک زرخیز گلستاں پہ ہوا ہے یہ ستم
مولد و منشاء خود شاخ کو سمجھا ہے گل

الفت شاخ میں گل خار کو اپناتے ہیں
پھول کی آنکھ میں اغیار ہوئے ہیں بلبل

خطِ تفریق بنی شاخ بہم پھولوں میں
کیوں تجانس کا رکھے ربط سمن سے سنبل

تفرقہ اور بڑھا شاخ پہ غلبہ کے لیے
خار و گل دست و گریباں ہیں گیا بھید کھل یہ

خار لتعداد و تقدیم پہ ہیں اکثر نازاں
پھول تہذیب و تجمل میں بنے شمع چگل

برگ کا شاخ پہ دعویٰ ہے زباں پر مبنی
انقطاعیت بے جانے کھلائے ہیں گل

منتشر پھول ہوا چاک شکم کچھ ایسا
جز دگل مٹ کے ہر اک پنکھڑی بن بیٹھی کل

خواہ اس کشمکش و جنگ میں جیتے کوئی
شاخ کو راس نہ آئے گا کسی کا چنگل

مشترک قدر فقط خاک چمن ہوتی ہے
ہو یہ مقصود تو برپا ہو محض فتنہ و غل

کٹ کے شانہ سے تو دندانے ہوئے بے طرف
غیر ممکن ہے زبیر اب وہ سنواریں کاکل

--*--

دیروز پرستی

صرف ایک ہی پہلو پہ نظر رکھ کے یہ کہنا
کس نام سے گذرے ہوئے لمحوں کو صدا دوں

ہرگز نہیں زیبا یہ تجھے قلب پریشاں
دیروز پرستی سے تجھے کیوں نہ چھڑا دوں

تاریخ نے ہر دور میں دُہرایا ہے خود کو
فردا ہی کہ دیروز کو آواز ذرا دوں

لمحات گذشتہ میں بھی تو درد و الم تھے
موجودہ دکھوں میں بھی مسرت کا پتہ دوں

مستقبل و حال اپنے بنا صدق دلی سے
ویرانۂ حالات کو گلزار بنا دوں

جامِ جم امروز میں عکسِ رُخِ فردا
ماضی ہی کی تصویر لیے پھر سے دکھا دوں

کل تھی کہ ہو آئندہ بہر حال خوشی ہے
کیا حرج رہے لذت و پیمانہ نیا دوں

مانا کہ کبھی روز گذشتہ نہیں آتا
کل روشنی آئے گی زبیر اسکو بھلا دوں؟

بھول میں آنکھ مل گئی رشکِ قمر تو کیا ہوا
غیر ارادی طور پر پہلی نظر نہیں خطا
حدِ نگاہ مغرب و حدِ خیال شرق ہے!
نیر یاریاں غروب اور وہاں طلوع ہوا
آتشِ ہجر سے کہیں نورِ وصال سے کبھی
ظلمتِ دل رفع ہوئی سجدۂ شکر ادا کر
عضو کریں گے حشر کے روز کلام تھا یقیں
گوشۂ چشمِ یار نے اور یقیں بڑھا دیا
چہرۂ مہ پر آندھیوں سے نہ غبار آسکے
گرد ملال آج پھر کیوں ہے بروی مہ لقا
عقلِ جہاں بین تامل کا شکار ہو گئی
اُمّ صفات عشق ہی حسنِ ازل کو پاسکا
قلبِ جواں پر اختیار ان کو اب نہیں مگر
حسن کی بارگاہ میں کون کہے پہ بر ملا
خوابِ عزیز ہے مری موت نہیں یہ غم نہ کر
خود ہی کھلے گی آنکھ آباد تو ہو جہاں ذرا
تیشہ قدر ایزدی مصلحت ای زبیرؔ ہے
خیر و فلاحِ سنگ ہے سنگ تراش کی جفا

رقیب سے

جلوۂ گل برائے خار نہیں
یہ سمجھتا ہے عندلیب فہیم

جلوہ گر ہے مراد جلوہ فگن
طور ہوتا نہیں رقیب کلیم

تجھ کو ضمناً ملے جھلک تو کیا
میں ہوں بے غش بہ لطف تو ہے الیم

میں بنا اس کی آنکھ کا کاجل
سُرمۂ چشم غیر ہے تو ندیم

میں مخاطب ہوں اور تو سامع
ہمسری کی ہے تیری سعی عقیم

حبّ محبوب بہ زبغض رقیب
جانتا ہوں ہے کیا صحیح و سقیم

بے بصر خار و باخبر بلبل
گرچہ وہ دور یہ ہے پاس مقیم

شمع کی روشنی میں سب ذوحظ
آگ میں ہے مرا کوئی پہ سہیم

کیوں سمجھ لے تجھے زبیر رقیب
تو نگاہِ نگار میں ہے عدیم

○

گُل دستہ اور خریدار

گُلِ گل دستہ زیبِ دست و طاق مشتری ہو کر
تلاشِ جاہ میں کی یہ بے غلط جا منتخب تو نے
تری توقیر مضمر ربط بیخ و نخم ہی میں تھی
پی عاجلِ مفاد اس طرح کی ذلت طلب تو نے
چمن سے منقطع ہو کر نمائندہ بنا کیسے
حمایت میں چمن کی تو کبھی کھولے نہ لب تو نے
بحیثیت گل گلشن ہے مرنا شاخ پر بہتر
رہن رکھ دی مہک اپنی خوشی سے بے سبب تو نے
لحافِ خاک گلشن غیر کے قدموں سے اچھا تھا
مگر انجام کو ناداں کبھی سوچا ہے کب تو نے
سمجھنا خار گلشن کو گل دستہ سے الفت
مثال خود فریبی مشتری دی ہے عجب تو نے
توقع ہے کھلیں ہر شاخ پر بس پھول کاغذ کے
بزورِ زر کیا فطرت بدلنے کا غضب تو نے
یہی بے جا امیدیں تو فساد و فتنہ کی جڑ ہیں
شکار سایہ میں اکثر گنوائے روز و شب تو نے
خیال خام بے بنیاد مفروضہ یہ ہیں جالے
کسی کو کیا مقام اتنا تلک سمجھا نہ جب تو نے
خریداری کے بدلے باغبانی ہو سکے تو کر
دیا ہی مشورہ آخر زبیر بے ادب تو نے

ابنا

قطعہ المسمّٰی بہ معاہدہ

ہوائیں بوئے گل کا ساتھ دیتی ہیں بشرطیکہ
جہاں دم توڑ دے گی تو تزا مدفن بنا دینگے

بغیر شرکت گل ہو اجارہ عطر بیزی کا
تری بو سے جہاں چاہیں گے ہم گلشن بنا دینگے

نہ ہوگا اختیار راہ کا بھی تجھ کو حق حاصل
تری منزل بھی حسبِ حال جان من بنا دینگے

چمن سے حظِ اغلب ہم کو مل جائے جو قانوناً
تو ہم دو جے لیڈروں سے تجھے ایمن بنا دینگے

حریفوں کی جسارت سے جو بھڑکے جنگ کے شعلے
چمن کو لا محالہ آگ کا ایندھن بنا دینگے

مؤخر کر دے تو نے مفاد اپنے جو تفویضاً
تو آخر باغ کو اک بار پھر دُلہن بنا دینگے

ہوا شعلوں کو دینا یا بجھا دینا یہ ہم جانیں
غرض اپنے مشیروں کا تجھے موطن بنا دینگے

نئے کانٹے بچھا دیں گے، کچھ اپنی اور سے دیکر
ضرورت پر پڑوسی کا تجھے دشمن بنا دینگے

نتیجہ دوسرے کے دوش پر تکیہ کا کیا نکلا
خزاں دیدہ ترے گلشن کو یہ گرہن بنا دینگے

پریشان بوی و گل پژمردہ ویران ہے گلشن
خبر کیا تھی حلیف اک دن چمن کو رن بنا دینگے

تری مٹی کے نیچے ہیں ذخیرے تیری قوت کے
تری قوّت کے سرچشمے تجھے مامن بنا دینگے
لہو کا آخری قطرہ تلک بھی چوس لیں گے یہ
تو یہ سمجھا ہے اپنے ملمس سے چندن بنا دینگے
کفائت کے بنا ہے ربط استحصال کی اک شکل
قوی کمزور کو کچھ اور بھی اہون بنا دینگے
زبیر اک بار پھر سے عزم لبدہ توکل کر
تجھے اللہ کی تلوار کا آہن بنا دینگے

مکرِ الٰہی

خوشی منائے نہ فرعون یہ شکست نہیں
شعیب کے لئے موسیٰ فرار ہوتے ہیں!
فلاحِ یوسفِ محسود کا تقاضہ تھا
جو بھائیوں کے حسد کا شکار ہوتے ہیں
عزیزِ مصر بنے تاکہ ماہِ کنعانی
یہ کامیاب زلیخا کے وار ہوتے ہیں
ہوئی ہے آتشِ نمرود قرب کا مرکب
خلیل شوق سے اِس پر سوار ہوتے ہیں
مبین فتح کی تمہید ہے حدیبیہ
حضور خوش ہیں عمر بے قرار ہوتے ہیں
طیور ساتھ لیے آئے دام و دانہ تک
شکار دیکھئے باصد وقار ہوتے ہیں
مُفر تجھ کو ہوا مکر کامیاب ترا
بہ غیر نفع مگر بے شمار ہوتے ہیں
ہے ماکرین میں برتر وہ قادرِ مطلق
بس اُس کے امر کے کم رازدار ہوتے ہیں
زبیرؔ شرِ عدو ہی میں خیر ہو شاید
قضا کے حکم کے پہلو ہزار ہوتے ہیں

مُکافات

شعاعِ شمس تیر اور سطحِ آب ہے ہدف
ممد ہو گیا فلک بصورتِ کمان ہے

عمل تبخرات کا شدید سے شدید ہے
بظاہر اپنی بے بسی کی بحر داستان ہے

فتادگی ہے طبعِ بحر و دامنِ فلک بلند
نہیں ہے شمس زد میں بحر کی یہ اک گمان ہے

مقاومت کی روح پھونک دی مگر بخار میں
یہ اختیارِ شکلِ ابر اسی کی ایک شان ہے

معیتِ اسیریں گو مجبرین آ گئے
گھٹائیں بن کے چھا گئے سیاہ آسمان ہے

وہ قرصِ خور کہ دیکھنا کبھی جسے محال تھا
اسیر و ناپدید ہے اندھیرا پاسبان ہے

الگ ہزار بوند ہوں سحاب بن سکیں نہ وہ
جماعتوں پہ دیکھئے تو دستِ رب حصان ہے

عطا و سلب قوت اور خیر غیر معتبر
نہیں بنفس خود وہ کچھ بدستِ حق عنان ہے

لگائی ضرب غیر پر تو اس کی زد میں آ گئے
ستم رسیدگان سے بھلا کہیں امان ہے

جسارتِ قوی نظر مرور وقت پر رہے
ہوا کا رُخ بجانب ضعیف و ناتوان ہے

مرادف و ضمانتِ نجات شدتِ الم
ستم جو اعتدال پر رہے تو ضیق جان ہے

ستم رسانی و رسیدگی کے اس نظام میں
مصالح وسیع کا زبید اک جہان ہے

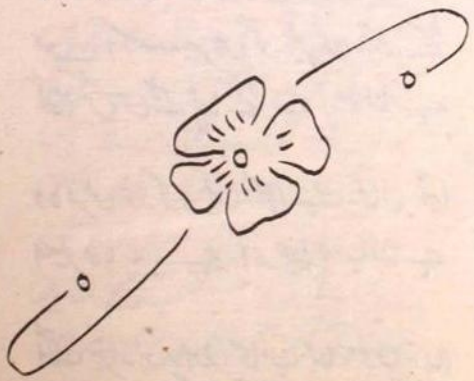

مودّت

دوستی کی قبا میں ہے کچھ نقص
یا مِلا مجھ کو قامت ناساز

یار بے عیب کی نہیں خواہش
عیب جو، دوست سے پر آیا باز

سر کہیں سے نکالتا ہی حسد
کیوں گریباں ملا ترا ہم راز

زخم کھا کر بھی رہ گیا خاموش
مرحبا بس تری زباں دم ساز

پاس رہ کر چلائے تو نے تیر
غرق حسرت ہوا ہر اک سرباز

آہ مضراب پر کرے ہر بار
دل وہ کم ظرف سا نہیں ہے ساز

ٹوٹنے پر کراہتی ہے ہر چیز
دل گو ٹوٹا پر آئی نہ آواز

بال شیشہ کا دیکھا ہے جہاں
بال دل کا مگر ہے صیغۂ راز

گل کھلائے ہیں زخم نے دلمیں
بو نہیں ان میں جو کرے پرواز

شیشہ دل نے کھائے ہیں پتھر
آخری تو، نہیں سے سنگ انداز

آتش کان سی ہے دل کی آگ
سنگ ہوتے ہیں گوہر ممتاز

زندگی کا ہے موڑ یہ بھی زبیرؔ
اک نئے باب کا ہوا آغاز

مُستزاد

ناچیز رہا موردِ الزام بہت ہے — احسان یہ کم ہے
ہو کم نہ نوازش تری مادام بہت ہے — بس اک یہی غم ہے
میرے لیے ان کا یہی اعلام بہت ہے — خوش ہو دلِ غمگین
"شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے" — اتنا تو بھرم ہے
پھر آج اسی خاطرِ عاطر پہ میں گزرا — ہے حسن تو ارزاں
باور نہ کرو تم مجھے الہام بہت ہے — دل تیرا کرم ہے
صد حیف مری چشمِ گہربار ہوئی خشک — یارب ملیں آنسو
دامن ابھی آلودہ آثام بہت ہے — امید رحم ہے!
ہوتے رہیں آفاق پہ طوفان ہویدا — پرواہ نہیں کچھ
مجھ کو دلِ پروردہ آلام بہت ہے — سینے میں تو دم ہے
میرا دلِ سنگین بھی ہو منبعِ چشمہ — مل جائیں جو موسیٰ
اس کے لیے اک ضربِ مگر تام بہت ہے — قسوت گواتم ہے!
خاصیت خفاش نہ ہو ہم پہ مسلط — لگتا ہے کچھ ایسا
کیوں آج یہ تاریکیٔ اوہام بہت ہے — کیسا یہ ستم ہے
دن عمر کے گزرے ہیں اس امید پہ یارب — ہو کاش اجابت
آغاز سے بہتر ہو گر انجام بہت ہے — نیکی کا لعدم ہے
ہے دستِ زبیر آب بھی بڑا بت شکنی میں — واللہ یہ سچ ہے
ہاں قلب مگر قاتلِ اصنام بہت ہے — جانکاہ الم ہے

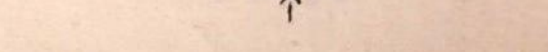

عیب ہے پر حق نہ چھینو مجھ سے سچی بات کا
داغ ہے پر چاند روشن اک جہاں کو کر گیا

قابلیت کی بنا پر فرق ہے تاثیر میں
بو ہوئی آوارہ لیکن گل ہوا ہی سے کھلا

جان کر میں نے ہٹالی اس کے چہرے سے نظر
تاکہ دزدیدہ نگاہ سے وہ بھی مجھ کو دیکھتا

گرم لوہے کو تو دے جاتی ہے خاطر خواہ شکل
نقشِ پروانہ نہ ہرگز شمع پر لیکن بنا

آسماں کو دیکھنے سے ہے سمندر نیلگوں
تکتے تکتے تجھ کو تیرا رنگ مجھ پر چڑھ گیا

ہے سبھی کی انگلیوں پر نام تیرا حُسن میں
آ گیا کھل کر اگر میری زباں پر کیا ہوا

سینکڑوں ہیں پھر بھی لو وارد کو کب انکار ہے
وسعتِ قلبی تمناؤں سے کوئی سیکھتا

میں زبیدؔ اب بھی وہی ہوں چاند کی مانند پر
بے وجہ لوگوں کی نظروں میں بڑھا گاہی گھٹا

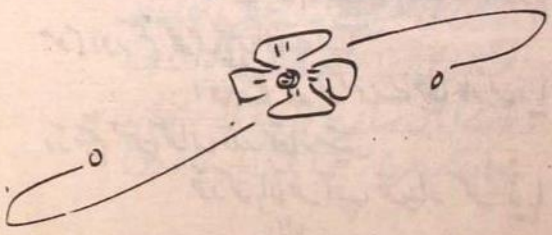

قطعۂ دعائیہ

ویرانگیٔ قلب میں آباد کر ہمیں
تیار تیرے حکم سے کعبہ نیا کریں
نمرود نے لگائی ہے ہر دم میں ایک آگ
پھر اس میں تیری یاد سے گلشن بپا کریں
اللہ تشنگی پہ ہماری کرم کرم
پھر ایڑیاں رگڑنے کی کوشش ذرا کریں
سلوہ و من و مائدہ بھیجے ہیں اس سے قبل
ممکن نہیں کہ تیری دعا میں خطا کریں
اکلِ حلال کے لیے پروردگار سے
انگوٹھے میں سے رزق کی خاطر دعا کریں
شاہیں کو احتراز ہے اکلِ حرام سے
اپنی ہی ہڈیوں سے مہیّا غذا کریں
مروہ صفا کو چھوڑ کر کرتے ہیں ہم سعی
اللہ لا یضیعنا کیسے کہا کریں
تیرے نہ ہو سکے یہ نہیں غیر کے تو ہم
اغیار سے ذلیل کہاں تک ہوا کریں
بیداد اپنے آپ سے کر کے زبیرؔ ہم
اپنے خلاف رب سے شکایات کیا کریں

نظم مسمّی "بہ جبرِ الٰہی"

عشق ہوا تو معجزۂ دین ہو گیا
دانہ اگر ہو شق تو درخت ایک ہو گیا

بیکار ہے قلم بھی اگر شق نہ ہو دہاں
پتھر کی شق تلک سے ہوا چشمہ اک رواں

بارش ہوئی فلک سے اگر بجلیاں گریں
کلیوں کا دل جو چاک ہوا پھول بن گئیں

مہندی پسی تو پا سکی دستِ نگار تک
شبنم کرن کے تیر سے پہنچی ہے تا فلک

سینہ کے چھید سے ہوئی نے کو زباں عطا
داغِ جگر ہی لالہ کی ارزش کرے بیاں

خلعت ہرا زمیں کو ملا ہل کے زخم پر
گہرا اگر ہو زخم تو منعم دے سیم و زر

برق تجلی طور پہ چمکی تھی اک دفعہ
لوگوں نے اس کی راکھ کو دی آنکھ میں جگہ

ہے قدرِ ایزدی کا صلہ جبر بارور
القصہ رنج بر ہی بالآخر ہے گنج بر

بال آ گیا ہے شیشۂ دل میں زبیؔر کے
آئینہ ساز دیکھئے دیتا ہے کیا اسے

نام : ڈاکٹر محمد زبیر قریشی

ولدیت : غلام نبی قریشی

تعلیم : ایم۔اے۔ پی ایچ۔ڈی

پیشہ : صدر، شعبۂ اردو فارسی، گجرات یونیورسٹی

پتہ : "کاشانہ" ۱۱، آشیانہ سوسائٹی، جیوراج پارک،
احمد آباد۔ ۳۸۰۰۵۱

تصانیف

تراجم :۔ امراؤ جان ادا کا گجراتی ترجمہ

۔ کنہیالال منشی کی ناول پرتھوی ولبھ کا اُردو ترجمہ

۔ اُردو طنز و مزاح کے منتخب مضامین کا گجراتی ترجمہ

۔ عربی و فارسی کے مخطوطات کی فہرست

اور

متعدد تحقیقی مقالات